

# ہلالِ جرأت

PDFBOOKSFREE.PK



عمیرہ احمد





موسم ابھی تک ویسا ہی ہے جیسا پچھلے دنوں سے تھا۔ تیز ہواؤں کے ساتھ برف باری ہو رہی ہے۔ اور اس کا سلسلہ کب رکے گا یہ کوئی نہیں جانتا۔ دو گھنٹے کے بعد میں کیا کھاؤں گا۔؟ پانی کا تو خیر کوئی مسئلہ نہیں۔ برف لے کر پگھلائی جاسکتی ہے یا پھر ایسے ہی چوس لوں گا یا چوسنے کی کوشش کروں گا اگر میری زبان کا درجہ حرارت برف کے درجہ حرارت سے زیادہ ہوا تو برف پگھل جائے گی۔ میرا سینس آف ہو رہا ہے میرا سانس بھی میرا ساتھ نہیں چھوڑ رہا۔

بعض دفعہ یہاں کی سردی سے مجھے یوں ہی محسوس ہوتا ہے جیسے میرے جسم کا درجہ حرارت بھی لب مائنس ہو گری سینٹی گریڈ رہنے لگا ہے۔ سینس آف ہو رہا ہے۔

اڑتالیس گھنٹے پہلے یہاں صرف بسکٹ اور پانی ہی نہیں اور بھی بہت کچھ تھا۔ گوشت کے ٹکڑے سوکھے ہوئے ٹکڑے۔ خشک میوے۔ خشک بھنے ہوئے خنے۔ اس وقت موسم خراب نہیں تھا ورنہ میں اس کی بھی راشن بندی کر لیتا۔ اور انہیں اس طرح اکٹھا نہ کھاتا۔ گوشت کے ٹکڑوں کا ذائقہ تو میں ابھی تک محسوس کر رہا ہوں حالانکہ انہیں کھائے اڑتالیس گھنٹے گزر چکے ہیں۔ پہلی دفعہ انہیں اس طرح کھانے کا اتفاق ہوا ورنہ میں انہیں ریکا کر استعمال کرتا تھا۔ اور انہیں چباتے رہنے سے مجھے دانتوں تلے پسینہ آگیا اور پھر ان میں موجود نمک۔ میں نے پھر بھی انہیں کھا ہی لیا۔ وہ بالکل ربو کی طرح تھے۔ چباتے جاؤ۔۔۔ چباتے جاؤ۔۔۔ مگر ٹوٹنا مشکل ہو جاتا

میں نے اپنی آنکھوں کو مسلتے ہوئے ان میں اترنے والی نیند کو بھگانے کی کوشش کی۔ پچھلے اڑتالیس گھنٹوں سے میں سو نہیں سکا تھا اور اگلے گھنٹے گھنٹے مجھے اسی طرح جاگتے رہنا تھا۔ مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ باہر گرئی ہوئی برف نے رات ہونے سے پہلے ہی ہر چیز کو مفلوج کر دیا تھا۔ ہر چیز کو مفلوج؟ نیند نے واقعی میرے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ یہاں کون سی چیز ہے جو مفلوج ہو سکتی ہے؟ مردہ پھاڑوں کی مردہ چوٹیاں؟ گہری کھائیاں؟ منوں کے حساب سے بڑی ہوئی برف۔؟ صدیوں سے یہیں بڑے ہوئے چٹانوں کے یہ ٹکڑے۔۔۔ یا آٹے سامنے اوپر نیچے چھوٹوں پر مودودان چوٹیاں اور بکڑوں کے اندر حشرات کی طرح رینگنے والے میرے جیسے چند انسان؟

میں نے بسکٹ کے ڈبے میں موجود آخری سیلن زورہ بسکٹ کو پانی کے چند قطرہ کے ساتھ اپنے حلق کے اندر اتار لیا۔ گھٹنوں میں موجود خوراک کا ذخیرہ اب ختم ہو چکا تھا۔ اڑتالیس گھنٹوں میں ہر دو گھنٹوں کے بعد میں نے چار بسکٹ اور پانی کے چھ گھونٹ پیے تھے۔

چھپانوے بسکٹ اور پانی کے ایک سو چوالیس گھونٹ مجھے اپنے حساب کتاب پر ہنسی آرہی تھی۔ زندگی میں پہلے مجھے ان دونوں چیزوں کو استعمال کرتے ہوئے گھنٹے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کوئی بھی نہیں کرتا۔ اور اب یہاں بیٹھ کر یہ کام کر رہا ہوں تو شاید وقت بھی کاٹنا چاہ رہا ہوں۔





میں اٹھنے والی ٹیسوں کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے  
 بائیں بازو اور دائیں ہاتھ کی بند سے بالی ہانڈہ راؤنڈ بھی  
 فائر کر دیا۔ دوسری طرف اب خاموشی چھا گئی ہے۔  
 پچھلے آرٹائلس گھنٹوں سے کی ہو رہا ہے۔ وہ فائر  
 کرتے ہیں یا شینگ کرتے ہیں۔ پھر میں فائر کرتا  
 ہوں پھر وہ فائر بند کر دیتے ہیں۔ پھر میں فائر بند کر دیتا  
 ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ شینگ یا فائرنگ کر کے  
 دروازے پر دستک دیتے ہیں "کوئی ہے؟ knock  
 Knock" اور میں جواباً "فائرنگ کرتے ہوئے کہتا  
 ہوں۔

"ہاں ابھی میں ہوں۔" وہ فائرنگ بند کر دیتے ہیں۔  
 "اچھا ٹھیک ہے پھر آئیں گے۔"  
 میں بھی فائرنگ بند کر دیتا ہوں۔ "Anytime"  
 میں مشین گن سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ ہاتھ میں  
 اٹھنے والی ٹیس ایک بار پھر مجھے کراہنے پر مجبور کر رہی  
 ہیں۔ دو دن پہلے اس ہاتھ پر گولی لگی تھی۔ اس وقت

میں نے سوچا تھا کہ یہ کتنی ہیبت انگیز ہے۔ مجھے بڑی  
 نقصان سے ملے گا۔ ان ٹیسوں کی وجہ سے میں نے اپنے  
 میرے پاس تھا۔  
 انھیں میں ایسا ہی دیکھتا تھا۔ ان کی آواز سن کر  
 مجھے کی ایک سی جیسے تھی۔ ان کی آواز سن کر  
 کہیں سے پھر شینگ شروع ہو گئی تھی۔  
 ان کی جگہ سے نہ سنائی دے رہی تھی۔ وہ وہی جگہ میرے  
 ہاتھ میں ابھی سر میں تھا۔ وہ وہی جگہ تھی۔  
 مشین گن میں چھوڑ دیتے تھے۔ تیار راؤنڈ والا تھا۔  
 پچھلے دو گھنٹے میں میں نے تین بار وقفے وقفے سے ان  
 کی شینگ گئے۔ جواب میں فائرنگ کی ہے۔  
 شینگ کے جواب میں فائرنگ۔؟ شینگ کے  
 جواب میں شینگ کرنے کے لیے میرے ساتھ کسی  
 کا ہونا ضروری ہے اور میں یہاں اکیلا ہوں۔

اسلحہ بھی بروی احتیاط سے استعمال کرنا پڑ رہا ہے۔ پتا  
 نہیں اب کتنے راؤنڈ باقی رہ گئے ہیں۔ بائیں ہاتھ



جب میں باہر اپنے کچھ جوانوں کے ساتھ تھا۔ مجھے دو گولیاں ملی تھیں ایک ہاتھ سے رکھ رکھاتے اور میرا گوشت اڑاتے ہوئے گزر گئی۔ دوسری ابھی بھی میرے ہاتھ میں موجود ہے میں خوش قسمت تھا۔ سات آدمیوں میں سے نچنے والا میں واحد آدمی تھا۔ یا پھر یہ قسمت تھا سات آدمیوں میں سے شہادت کا رتبہ نہ پالنے والا واحد آدمی تھا۔

واپس اندر آکر میں نے اپنی مرہم پٹی کرنے کی کوشش کی۔ ہاتھ سے نکلنے والا خون ہاتھ دیر کے بعد رک گیا تھا۔ وہ خطرناک نہیں تھا۔ مگر ہاتھ میں موجود گولی تب مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ اگلے دو دن یہاں سے بچے جانے کے بجائے مجھے یہیں گزارنے پڑیں گے۔

اب ہاتھ کی حالت دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ اسے کانپڑے کا ٹکڑا لٹا دیا گیا ہے۔ ابھی نہیں کہہ سکتا کہ صرف ہاتھ ہی کانپڑے کا ٹکڑا لٹا دیا گیا ہے۔ مجھے اپنی شکایت زنب کا خیال آ رہا تھا۔ اسے میرے ہاتھ بڑے پسند تھے۔

”ولید تمہارے ہاتھ تو مردانہ ہاتھ لگتے ہیں اور فوجیوں کے ہاتھوں جیسے تو بالکل بھی نہیں۔ اتنے نازک اور نفیس ہیں کہ میرا دل چاہتا ہے میں بعض دفعہ ان پر کیو ٹکس لگا کر دیکھوں کہ وہ کیسے لگتے ہیں۔“ وہ اکثر مذاق میں مجھے چھیڑتی تھی۔

اب اس وقت وہ اس ہاتھ کو دیکھ لے تو؟ میں سوچ رہا ہوں کنوآنے کے بعد یہ ہاتھ اسے ہجوا دوں۔ بذریعہ کوریئر سروس۔ شاید ایسی بات اس کے سامنے کہوں تو۔

”تمہارے پریکٹیکل جوکس کب ختم ہوں گے ولید؟ بڑے ہو جاؤ اب۔“ وہ یقیناً ”مجھ پر چلائے گی اگر وہی نہ تو تم میرا سینس آف ہیو مر۔“

میری کزن ہے وہ۔ خالہ زاد کزن۔ مشیت برے تو ابھی اسے صرف دو سال ہی ہوئے ہیں اور یہ وہ بننے میں بس دو دن اور لگیں گے اگر یہ برف باری اسی طرح جاری رہی اور نیچے میں یکپ سے کوئی نہ آیا تو۔

یہاں ہزاروں فٹ کی بلندی پر کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحات کس طرح گزارے گا۔ جیسے میں اس وقت اندازہ نہیں کر پا رہا۔

مگر کوئی بات نہیں اگر وہ چھ آدمی برف کا کفن اوڑھ کر ہمیشہ کے لیے یہاں دفن ہو سکتے ہیں۔ اگر سامنے اونچائی پر موجود چوکیوں میں بیٹھے ہوئے دشمن کے فوجی بھی اسی برف باری اسی طوفان اسی تہائی اور ان ہی کھائیوں اور چوٹیوں کے ساتھ یہاں بیٹھے لڑ سکتے ہیں تو میں بھی لڑ سکتا ہوں۔ اگر وہ مٹی کے لیے خون دے سکتے ہیں تو میں بھی دے سکتا ہوں۔

”آخری آدمی اور آخری گولی تک لڑیں گے۔“ مجھے پی ایم اے میں بار بار دہرایا ہوا سبق یاد آنے لگا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”آخری آدمی۔“ آج پہلی بار ان دونوں چیزوں کی وضاحت اور صحیح مفہوم سمجھ میں آیا تھا۔ میں نے مشین گن کے باقی راؤنڈز کو دیکھنا شروع کر دیا۔ آخری آدمی آخری گولیاں گن رہا تھا۔

الٹا پس کھتے پہلے میں یہاں اس طرح اکیلا نہیں تھا میرے چھ ساتھی میرے ساتھ تھے۔ مگر اب میں یہاں اکیلا بیٹھا ہوں۔ وہ چھ کے چھ باہر ہیں۔ پتا نہیں اتنی برف میں سے ان کی لاشیں نکل جی سکیں گی یا نہیں۔ میں نے آنکھیں بند کر کے ایک بار پھر اس جگہ کے نکل و قوع کو اپنے ذہن میں لانے کی کوشش کی جہاں ان کی لاشیں تھیں۔ دو دن کی اس برف باری نے ہر چیز کو خاصا بدل دیا ہو گا۔ پھر برف کی تہہ در تہہ میں نے ہاپوسی سے سر ہلایا۔ شاید ان کی قسمت میں برف کی قبر ہی تھی۔ اور شاید میری قسمت میں بھی۔

دو دن پہلے کیا ہوا تھا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ دو ساتھی باہر گئے تھے۔ وہ بہت دیر کے بعد واپس آئے اور انہوں نے بتایا کہ انہوں نے چوکی سے باہر کچھ فاصلے پر کچھ نقل و حرکت دیکھی تھی۔ ہم لوگ یک دم



ہے انہیں یہ بھی بتا چل گیا تھا کہ ابھی مزاحمت ہو سکتی

ہے۔  
پچھلے اڑتالیس گھنٹوں سے میں وقفے وقفے سے  
فائرنگ کرتے ہوئے انہیں یہی بتانے کی کوشش کر رہا  
تھا کہ چوکی ابھی مکمل طور پر خالی نہیں ہوئی۔ ابھی وہاں  
کوئی نہ کوئی ہے۔ اور وائرلیس پر میں کیمپ سے  
رابطہ قائم کرتے ہوئے بھی میں آوازیں بدل بدل کر  
اپنے ساتھیوں کے نام استعمال کر رہا تھا تاکہ اگر  
ٹرانسمیشن بھی بھی طرح درمیان میں سن لی جائے  
تو وہ بھی سمجھیں کہ چوکی میں ابھی خاصے لوگ ہیں  
اور دوسرے حملے کا نہ سوچیں۔

ایک دوسرے پر فائرنگ اور شینگ کرتے ہوئے  
ہم پاگل لگتے ہیں۔ نہ انہیں ہم نظر آتے ہیں نہ  
ہمیں۔ یہ سرحدی یا میدانی علاقہ تو نہیں کہ فوجی  
آمنے سامنے بیٹھے نظر آئیں۔ بعض دفعہ تو یوں لگتا  
ہے جیسے فوجی اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے اس طرح  
اندھا دھند گولیوں کا استعمال کر رہے ہیں۔ ہو سکتا  
ہے ان کی چوکی میں بھی اب چند ہی لوگ موجود ہوں  
اور ان میں سے بھی کچھ میری طرح زخمی ہوں۔ اور  
شاید ان کے فوری طور پر دوبارہ حملہ کرنے کی وجہ بھی  
یہی ہو۔ میرے قیامے اور اندازے جاری ہیں۔  
پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں یہاں اکیلا بیٹھا میں اور کر  
بھی کیا سکتا ہوں۔

دو دن پہلے پہلائی آئی تھی۔ نہیں اسکی۔ اور  
مجھے ابھی یہاں آئے صرف چھ ہفتے ہی ہوئے ہیں۔  
چھ ہفتے میں ہی میں بہت کچھ سیکھ گیا ہوں۔ آج  
سالگرہ بھی تھی میری۔ چھ ستمبر کے دن ہوتی ہے  
میری سالگرہ۔ پی ایم اے میں میرا مذاق اڑایا جاتا  
تھا۔

”تمہاری پیدائش ہی وطن کے دفاع کے لیے ہوئی  
ہے۔“ میرے ایک انسٹرکٹر نے ایک بار مجھ سے کہا  
تھا اور آج یہاں بیٹھا میں سوچ رہا ہوں کہ بعض باتیں  
کتنی سچی ہوتی ہیں۔

کچھ دیر پہلے میں نے اپنی سالگرہ کے دن سے ایک

چوکتے ہوئے۔

پچھلے ماہ ہماری دو چوکیوں پر بھارتی فوجیوں نے حملہ  
کیا تھا۔ ایک چوکی پر انہوں نے قبضہ کر لیا اور ہم اسے  
واپس لینے میں ناکام رہے۔ دوسری چوکی والوں نے  
اسیں پسپا کر دیا۔ اور اب یقیناً بھارتی باری تھی۔  
ہم نے اگلے (Igloo) میں موجود ساتھیوں کو بھی بلوا  
لیا۔ ایک ساتھی کو ہتھکے اندر پیچھو ڈال کر ہم سب باہر  
نکل گئے۔ وہیں جہاں انہیں دھڑکتی دیکھی گئی تھی۔  
وہاں واقعی کچھ لوگ تھے اور وہ ہماری ہی طرف آ رہے  
تھے۔ نہ صرف آ رہے تھے بلکہ ان میں سے کچھ  
خاصی اہم ہتھیار تھے جیسے اور وہ یقیناً ہم پر  
حملہ کرنے کے لیے تھے۔ اتنے تھے ہم پر کچھ  
لگتے تھے۔ اندر کچھ میں موجود ساتھی بھی کچھ  
اور بعد باہر رہے ساتھ کیا۔

ہم نے کچھ پسپا کر دیا۔ مگر پچھلے دنوں سے سارے  
ساتھی ہمارے کے گرد فوجیوں کی موجودگی میں یہاں  
آگیا۔ وائرلیس پر میں کچھ کچھ کہنے لگا۔  
وہاں کے بانی نقصان کا اندازہ اسے فوجیوں نے  
کیونکہ وہ کچھ کی باتیں بھی ہماری فوجی  
درمیان میں سے تھیں۔ تھے۔ میں نے کچھ  
اور لوگوں کو بھیجے۔ کچھ ملک پر یہ کچھ  
خراب ہونا شروع ہو گیا اور شہد قاتل ابھی  
کسی کو روکنا نہیں رہا۔

مجھے خطہ تھا کہ بھارتی فوجیوں نے پہلی قتل نہ کر  
ہیں۔ اگر یہ پتہ لگتے ہیں اس میں کچھ جانی  
نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ مگر ابھی حملہ کرنے پر تو انہیں  
میدان صاف ملا۔ کسی قسم کی کوئی مزاحمت اور پیش نہ  
آئی۔ مگر انہوں نے دوبارہ حملہ نہیں کیا۔ میری چوکی پر  
وقفے وقفے سے شدید شینگ اور فائرنگ کی گئی۔  
شاید انہیں بھی یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ہمیں خاصا جانی  
نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ اور وہ دیکھنا چاہ رہے تھے کہ  
ابھی چوکی میں کتنے لوگ موجود ہیں۔ کوئی ہے بھی یا  
نہیں۔ جواباً شینگ نہ ہونے سے انہیں ہماری  
افروزی قوت کا تو پتا چل ہی گیا ہو گا مگر فائرنگ ہونے



بہت پہلے ملنے والے وہ سارے کارڈز اور خط دیکھتے ہیں جو میرے گھر والوں اور زینب نے بھجوائے ہیں۔ میری بہن نے کارڈ میں لکھا تھا کہ وہ چاہتی ہے کہ میری عمر کم از کم دو سو سال ہو تاکہ میں ان کے دو سو سال اسے اس کی دوستوں کے گھر لے جایاں ہوں۔ دو سو سال؟

میرے چھوٹے بھائی نے مجھے کارڈ میں لکھا تھا کہ وہ میری بواہی کا بڑی شدت سے انتظار کر رہا ہے۔ چھلی دفعت ایک اور میں اس نے مجھے پانچ بار آؤٹ کیا تھا۔ اس کا اصل لہجہ تھا۔ "دو سو سال؟" اور میں نے پوچھا کہ

کب تک آئے گا؟ اس نے کہا کہ ایک سال میں آئے گا۔ تو میں نے کہا کہ اسے تیرہ سال میں آجائے تو اسے ہوا تھا۔ صرف ایک بار ہی آئے ہیں۔ اور وہ بھی ایک غلطی کی وجہ سے۔ اس میں ہوا کا مولی مولا میں تھا کہ اس بار اس نے مجھے پانچ بار آئے گا میں لکھا ہے کہ

اس بار اس نے اسے اس کے گھر لے گیا ہے اور وہ اس بار اپنے اس کارڈ کے لیے اس کے گھر آئے ہیں۔

شاید اس بار اس کے پاس اس کے گھر کی ایک تصویر ہے۔ شاید اس نے اس کے گھر کی ایک تصویر لے لی ہو۔ اسے ملے ہوئے ہے۔

میری لڑکی نے مجھے اپنے خط میں بتایا کہ وہ آج میں بھی آئے گی۔ وہ آج کل بہت خوش ہے۔ وہ آج کل بہت خوش ہے۔ وہ آج کل بہت خوش ہے۔

تمہارا خیال آتا رہا ہے۔ یہ خیال بہت اچھا ہے۔ انہوں نے تمہیں تمہیں سے خط میں یہ بار مجھے اپنا خیال رکھنے کی تاکید کی تھی۔ میری آنکھوں میں کی اترنے لگی۔ ان کا خط پڑھتے ہوئے میں اسی طرح

آبدیدہ ہو جاتا تھا۔ ماؤں کو میرات کا پلے سے پتا کیوں چل جاتا ہے؟ بابا کے خط میں پوش کی طرح نصیحتیں تھیں۔ "تم کو یاد رکھنا چاہیے کہ تم ایک فوجی ہو۔ فوجی کا کام اپنے کام میں Excel (ترقی کرنا) ہوتا ہے۔ ولید

زماں میں چاہتا ہوں سیاچن سے واپسی پر تمہارے سینے

پر کم از کم ایک میڈل ضرور ہو۔" انہوں نے خط میں لکھا تھا۔ کئی دن پہلے خط پڑھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ یہ بہت مشکل ہے آخر یہاں میں ایسا کر کیا سکتا تھا کہ ایک میڈل کا حق وار کھا آئے۔ مگر اب میں سوچ رہا ہوں کہ اگر یہ چوکی بیچ گئی۔ اور کھل جلد بیچ گئی تو ایک میڈل میرے سینے پر لگ ہی جائے گا۔ نشان حیدر نہ سہی۔ ہلال نہ سہی۔

زینب کا کارڈ ہمیشہ کی طرح گلاب کے سرخ پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ سرخ گلاب۔ اس کی زندگی میں پھول نہ ہوں تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ سوئٹ پی اور سرخ گلاب۔ وہ کبھی تبصرہ کو اسی سال پیدا ہوئی تھی جس سال میں پیدا ہوا تھا۔ اور منتہی سے پہلے تک وہ

شدید غصے میں آجاتی تھی جب میں اسے سب لوگوں کے درمیان زینب آیا کہا کرتا تھا۔ "Be have your self! ولید!

تمہیں شرم نہیں آتی مجھے آیا کہتے ہوئے۔" اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا اور خراش۔

"اس مجھے شرم والی کیا بات ہے۔ میں تو آپ کا احرام کر رہا ہوں۔ زینب آیا۔" میں بظاہر تنجیدگی سے

کہتا تھا۔ "اے احرام اپنے پاس رکھو۔ پانچ دن کا فرق مجھے تمہاری بات نہیں ہوتا۔ مجھے تمہارے

"میں کو حساب کتاب میں صاف رہنا چاہیے۔ اب چاہے کوئی ایک دن بڑا ہو یا ایک منٹ۔ بڑا تو بڑا ہی ہوتا ہے۔ زینب آیا۔" میں ڈھٹائی سے "پاپا" پر زور دیتا تھا۔

"تمہارا حساب اتنا اچھا ہوتا تو تم فوج میں ہوتے؟ انجینئرنگ یونیورسٹی میں نہ بیٹھے ہوتے میرٹ لسٹ پر ٹکرتے۔ وہ مجھ پر چوٹ کرتی۔" "آپا! وہ اور بات ہے۔" میں ایک بار پھر پاپا پر زور دیتے ہوئے کہتا تھا۔ "تم ہو جاؤ تمہارے ولید! تم بہت ہی mean انسان ہو۔" وہ ہنستے سے اٹھ جاتی۔



”اس بار میں کوئی لحاظ نہیں کروں گی کہ تم یہاں بیٹھے ہو۔ ملازم سے کہہ کر دھکے دے کر نکلواؤں گی تمہیں اگر اب مجھے آیا کہنا تو۔“ میں جانتا تھا اس بار یہ دھمکی نہیں تھی اور میں بار اسی طرح مجھے گھر سے نکلوا چکی تھی۔ میں نے اسے آیا کہنا چھوڑ دیا۔ میں اسے باجی کہنے لگا۔

اس کے باوجود اس کے ساتھ میری دوستی ختم نہیں  
ہوئی۔ ہم دیکھیں جس جگہوں میں نہیں تو سینکڑوں بار  
ایک دوسرے کی لڑکائی، یہ تھے۔ قریب کمر  
ہونے کا یہ نقصان تھا۔ میں اس کے بھائیوں کے ساتھ  
کھیلتا تھا اور میری عمر یہ وقت اس کے کمر بڑی گزرتا  
تھا۔ اس کے بھائیوں کے ساتھ میری بڑی دوستی  
تھی۔ نہ سب کے ساتھ ہی تھی عمر اس سے، لڑکائیوں  
ہو تاکہ۔

مفتی محمد رفیع الرحمن نے لکھا ہے کہ میں نے بھی یہاں اس  
میں غیبت کے فقرہ کو مٹا دیا تھا۔ مگر بعد میں  
میں نے یہ سمجھا کہ اگر اس فقرے کو مٹا دیا جائے تو  
الحمد للہ

اور بھی تو وہ۔۔۔ میں نے کہا کہ یہ بات تو مجھے پہلے  
 ان کی اپنی بات میں سمجھنے ہی تھی تو کون سی۔۔۔  
 میں ان سے کہہ رہی تھی کہ یہ بات تو مجھے پہلے  
 جوا کو سنا چاہیے جو کہ وہ۔۔۔ لیکن اب یہ بات تو  
 سننے کے بجائے دیکھنے کی۔۔۔

”تم سے تنہا ہوا تھا صرف بس اس نے وہاں کی محنت کر کے پورا کر کے لوہے کے اجینٹنگ یونیورسٹی میں ایمیشن ہو جاے۔“ وہ ایک بار پھر رونے لگی مجھے اس کی بات پر اور ہنسی آئی۔ ہاتھ میں ایک دم پھر ٹیسس اٹھنے لگی تھیں۔

چھ ستمبر کے سلسلے میں ریڈ یو پاکستان کی طرف سے منعقد کیے جانے والے شو کی تیاریاں اپنے پورے عروج پر تھیں۔ اس شو کو براہ راست براڈ کاسٹ کیا جانا تھا

اور مہمانوں میں جہاں فوج میں مختلف خدمات سرانجام دیتے والوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی وہاں شکرز بھی تھے۔

بال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جو مختلف جنگلوں میں واد شجاعت رہنے والے ہیرو کی وجہ سے کم اور نوجوان نسل کے نمائندہ گلوکاروں کو سننے کے لیے زیادہ جمع تھے۔

سب لوگ اپنی سیٹوں پر براہِمان ہو چکے تھے۔  
 کبیر ایک بار پھر اسٹیج پر چڑھ کر اپنی لائسنز کی رہنمائی  
 کر رہا تھا۔ ہال میں مکمل خاموشی تھی۔ گونجنے والی دوا  
 آواز کبیر کی تھی جو چھ ستمبر کے حوالے سے اپنے  
 لائسنز کو بڑے بڑے اعتماد انداز میں دہرا رہا تھا۔ اس کی  
 سیٹھی کبیر ہنسنے لگی تھیں۔ حاضرین کو دیکھ رہی  
 تھیں۔

صوبیدار (رٹائرڈ) کریم بخش نے انھوں نے  
دسویں نشست پر بیٹھے ہوئے ایک بار صراٹھا کر اس  
پر موجود روشنیوں کو دیکھا۔ اور اسے اپنا گلا خشک  
ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ زندگی میں پہلی بار وہ اس طر  
کے کسی شو میں شرکت کر رہا تھا اور وہ گھبراہٹ کا ش  
ہو رہا تھا۔ اس کی گھبراہٹ یہ سوچ کر اور بڑھتی جا رہی  
تھی کہ کچھ دیر کے بعد وہ خود اس اسٹیج پر موجود ہو گا  
اس کی پکیر سے بات کر رہا ہو گا۔ جو اس وقت بڑ  
قرآن کے ساتھ رٹے رہائے جملے ادا کر رہا تھا۔

کریم بخشش نے اپنے سر پر موجود قرالہی ٹوپی کو  
سے درست کیا اور پتہ ہوئی واسکٹ پر لگے ہو  
ایک اکلوتے تمغے پر فخریہ نظر ڈالی۔

وہ زندگی میں ان تمام مواقع کو انٹیلیوں پر مبنی  
جب اس نے یہ قرائلی ٹوپی اور واسکٹ پہنی تھی  
پہلا موقع وہ تھا جب اس نے اس میڈل کو وص  
کرنے کے بعد صدر کی طرف سے دیے جانے وا  
ایک عشاءے میں شرکت کی تھی۔ دو سرامو  
تھا جب اس کے بیٹے کی شادی ہوئی تھی اور تیسرا  
آج آیا تھا۔ واسکٹ اور قرائلی ٹوپی میں سے اب







میری چوکی پر حملہ کرنے کی حماقت نہیں کریں گے۔  
اگر وہ ایسی کوشش کرتے تو ہر طرف اور کھائیاں انہیں مجھ  
تک پہنچنے نہ دیتیں۔

”اور اگر کوئی دشمن ہماری مٹی کی طرف بڑھنے کی  
جرات کرے گا تو ہم لڑیں گے اس وقت تک جب  
تک کہ ہماری رگوں میں خون کی آخری قطرہ موجود  
ہو۔ اس وقت تک جب تک ہمارے وجود میں  
زندگی کی آخری دھڑکن ہو۔“

پھر ایک بار پھر کہہ دیا تھا۔ میں بارہا اس کی  
آواز ہال میں ابھر سکتی تھی۔ اس سے شہر میں ہر  
طرف پرستش کی گئی۔ اس کی قیادت میں ہزاروں  
مختوف ہو گئے تھے۔ انہوں نے ہتھیار اٹھائے۔ سنائی دے  
رہا تھا۔ پھر ایک بار کہہ دیا تھا۔ میں بارہا اس کی  
آواز ہال میں ابھر سکتی تھی۔ اس سے شہر میں ہر

طرف پرستش کی گئی۔ اس کی قیادت میں ہزاروں  
مختوف ہو گئے تھے۔ انہوں نے ہتھیار اٹھائے۔ سنائی دے  
رہا تھا۔ پھر ایک بار کہہ دیا تھا۔ میں بارہا اس کی  
آواز ہال میں ابھر سکتی تھی۔ اس سے شہر میں ہر  
طرف پرستش کی گئی۔ اس کی قیادت میں ہزاروں  
مختوف ہو گئے تھے۔ انہوں نے ہتھیار اٹھائے۔ سنائی دے  
رہا تھا۔ پھر ایک بار کہہ دیا تھا۔ میں بارہا اس کی  
آواز ہال میں ابھر سکتی تھی۔ اس سے شہر میں ہر

”زندہ قوم میں ایسے حاروں اور سردوں کی کمی نہیں  
ہوتی۔ زندہ قوم میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں  
ہوتی۔ ان قوتوں کی کمی نہیں ہوتی۔ ان قوتوں کی  
مٹی کے افان کے لیے ہمارے پاس ہے۔ اور ان میں ہال  
میں ہم آپ کو ایسے ہی چاہتے ہیں۔ ان قوتوں کی  
کی قوم احسان مند ہے۔“

میں نے اپنی ٹانگیں سکڑا لیں۔ جسم کو تھوڑا سا جھکون  
ملا۔ میں ایک بار پھر کمر میں رہے ہوئے اس ریڈیو کی  
طرف متوجہ ہو گیا۔ برف باری کے باوجود حیرت انگیز  
طور پر آواز بہت صاف تھی۔ مگر یہاں اکثر ایسے  
عجیب واقعات ہوتے رہتے ہیں۔

”میں سب سے پہلے اپنے پہلے مہمان کو بلواتا ہوں  
جن کا تعلق پاکستان ایئر فورس سے ہے۔ ۱۹۶۵ء کی

جنگ میں انہیں دشمن کے دو جہاز مار گرانے کا اعزاز  
حاصل ہوا۔ میں دعوت دیتا ہوں۔“

میری توجہ اچانک باہر مرکوز ہو گئی۔ مجھے محسوس ہوا  
تھا برف باری رک گئی تھی۔ میری حساسیت یک دم  
جیسے بیدار ہو گئی تھی۔ میں اپنے ہونٹ جھپکتے ہوئے  
دائیں ہاتھ سے دیوار کا سہارا لیتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔  
اگر برف باری واقعی رک گئی تھی تو ایک بار باہر کا جائزہ  
لینا ضروری ہو گیا تھا۔

مجھے موسم کا اندازہ لگانا تھا۔ کیا اس وقت پہلی کاپڑ  
کی کوئی فکارت ممکن تھی۔ اگر برف باری اگلے کئی  
گھنٹے کی رسی تو دشمن کا دوسرا حملہ بھی ہو سکتا تھا۔

ان کی حکمت عملی کے بارے میں میں کچھ نہیں  
جانتا تھا مگر یہ ضرور اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ اس چوکی کو  
محاصرہ کرنے کے لیے بے خوف تھے۔ یہ اندازہ تو  
انہیں ہو ہی چکا ہو گا کہ پہلے حملے میں ہمارا جانی نقصان  
ہوا ہے کیونکہ انہوں نے ہمارے جوانوں کی لاشیں  
دیکھ لی ہوں گی اور وہ فوجی جو پسپا ہونے کے بعد واپس  
چلے گئے تھے انہوں نے یقیناً ”اس بات کی خبر آگے دی  
ہو گی۔ اب چوکی میں کتنے آدمی موجود ہیں۔ اس کا  
اندازہ حساس نہیں ہو گا۔ لیکن اگر وہ ہماری  
لاشیں لگن گئے تھے تو وہ جانتے ہوں گے کہ اب چوکی  
میں دو چار سے زیادہ لوگ نہیں ہوں گے۔“

اگرچہ میں نے وائرلیس پر بار بار گفتگو کے درمیان  
دو تین مختلف آوازوں اور جھجوں میں بات کی۔ مگر  
— گفتگو درمیان میں سننے والے لوگ کتنے بے  
وقوف یا کتنے ہوشیار تھے اس کا اندازہ میں نہیں کر  
سکتا تھا۔ یہ بات یقیناً ”وہ بھی جانتے ہوں گے کہ  
چوکی پر ابھی تک کوئی کمک نہیں پہنچی۔ کیونکہ موسم  
نے ایسی کسی کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔ اور اب برف  
باری رک جانے پر وہ اندھیرے میں اپنی جان بھری  
رکھ کر دوسرے حملے کا بھی سوچ سکتے تھے۔ ایک بار باہر  
جانا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے سر کو جھپکتے  
ہوئے اپنے ہوش و حواس کو بحال رکھنے کی کوشش کی  
اور لڑکھڑاتے قدموں سے آہستہ آہستہ باہر نکل











شکار وہ پہلی دفعہ وہاں آکر ہوا ہو گا۔ میں جانتا تھا میں محسوس کر سکتا تھا۔ اس کی شمالی کونے اس کے خوف کو۔

”مگر پھر بھی کچھ تو مسائل پیش آئے ہوں گے آپ کو؟“ کبیر نے اصرار کیا۔

”ہاں تھوڑے بہت مسائل پیش آئے تھے۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ ہم نیچے سے ۲۰ لوگ اوپر جانے کے لیے چلے تھے مگر وہاں صرف تین پہنچے تھے۔“

کریم بخش ایک بار پھر جیسے کسی ٹرانس میں چلا گیا۔ ”رستے میں پنا نہیں چلتا تھا۔ کون کہاں گیا۔ کون کہاں پھسل گیا۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ رسی باندھ کر چلتے تھے پھر بھی۔ وہاں برف سے ڈھکی ہوئی کھاگیاں تھیں۔ ہم ایک دوسرے کو بچا بھی نہیں سکتے تھے۔“

پہلی دو میں بیٹھ ہوئے ایک افسر نے جھائی لی۔ شو کچھ زیادہ ہی لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ اسے ابھی ایک پارٹی میں بھی شہرت کرنی تھی اور وہاں کا ماحول یقیناً یہاں کے ماحول کی طرح Sombre نہیں ہو گا۔ اس نے قدرے بیزاری کے ساتھ سوچا۔ ”اب ان چیزوں کی وجہ سے میں اٹھ کر جا بھی نہیں سکتا۔ اور اوپر سے یہ فضول آدمی اتنے لمبے لیے Pause لے رہا ہے۔ اس کو چاہیے جلد ہی بات ختم کرے۔“ وہ بیزاری سے اسٹیج کو دیکھنے لگا۔

”آپ کے چہرے پر یہ جو نشانات ہیں یہ کس چیز کی وجہ سے ہیں؟“ کبیر اب اس آدمی سے پوچھ رہا تھا۔ کریم بخش نے بے اختیار اپنی ناک کو چھوا۔ ”برف سے جل گیا تھا میں۔“

”فرسٹ ہانڈ۔“ میں نے زیر لب دہرایا۔ دو دن پہلے میں اس کا شکار ہوا تھا جب میں اوندھے منہ برف پر گر ا تھا اور۔

”میں خوش قسمت تھا میرے ہاتھ اور پیروں کی صرف تمام انگلیاں ہی کاٹنی پڑیں۔ باقی بہت سے ساتھیوں کی ٹانگیں اور بازو بھی کاٹنے پڑے۔“ کریم

ہاں میں کچھ کھلکھلا جیٹیں ابھریں۔ کریم بخش اب جیسے غلامیں کسی غیر مرئی چیز کو دیکھ رہا تھا۔

”برف۔“ میں نے سمجھے ہوئے انداز میں دیوار کے ساتھ نیک لگا دی۔ ”ہاں برف کے علاوہ یہ اور ہے بھی کیا؟“ میں نے سوچا۔ برف کا قبرستان ہے۔ یہ وہی برف جو اس وقت میرے سات ساتھیوں کو ڈھانپ چکی ہے۔

ریڈیو میں سے کواز نہیں آ رہی تھی۔ کریم بخش شاید کچھ اور لفٹوں کی تلاش میں تھا۔ پہلی موندہ برف بن لی روشنی میں ٹھنڈی کوانڈھاں جتنی ہے اور رات کے اندھیرے میں ہر جگہ ٹھنڈی جی۔ یہاں صرف دشمن کا خوف نہیں ہو گا۔ برف کا خوف بھی ہوتا ہے۔ شاید میں بھی سسرے اس سوال پر اسی طرح ایک لفٹ بول کر لوں گا سوچا کہ میں انتظار کر رہا تھا اس شخص کے منہ سے نکلے ایسے لفظوں کا۔

”بہت برف۔“ میں نے سوچا۔ ”اس نے لڑکھاتے ہوئے ہون شروع کیا۔ کبھی ایک اور۔“ چروں کے نیچے زمین پر۔ اب۔“ چابی۔ نہیں برف عاب ہو جائے۔“ میں نے سوچا۔ ”کے۔“ وہ اپنی بات مکمل نہیں کر سکا۔ ایک بار پھر وہ اسی طرح تنہا میں صورت لگا۔ کمپلو نے مداخلت کی۔

”آپ پہلے فوجیوں میں تھے ایک تھے؟“

”کیا مشکلات پیش آئیں آپ وہاں مجھوائے جانے۔“ یہ۔“ خاص طور پر تب جب آپ کے پاس آج جیسی سہولیات بھی نہیں تھیں۔“

”کوئی مشکلات پیش نہیں آئیں۔“ کریم بخش نے یکدم کسی مشین کی طرح کہا۔

”جذبہ تھا ہم میں۔ ہم لڑنے گئے تھے وہاں۔“

میں اب اس آدمی کے لہجے کو پہچان سکتا تھا۔ کسی مشین کی طرح اب وہ وہ باتیں کہہ رہا تھا جو طوطے کی طرح رٹائی جاتی ہیں۔ وہ سامنے بیٹھے اتنے جرئوں کے سامنے اس خوف کا اظہار نہیں کر پا رہا ہو گا جس کا



بخش نے دسیوں انگلیوں سے محروم اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔

"اب ختم بھی کریں یہ انٹرویو۔ یہاں نہیں۔ ابرار کو کب بلائیں گے۔ میں اس کے گلے سننے کے لیے آیا ہوں اور یہ اسے بلا ہی نہیں رہے۔" ہال کی ایک نشست پر بیٹھے ہوئے ایک نوجوان نے اپنے دوست سے ہزاروں کے ساتھ کہا۔

"میں خود شاید وہ منی کے انتظار میں بیٹھا ہوں۔ پہلے گانا گوانا چاہیے تھا اس سے۔" اس کے دوست نے کہا۔ "بہت بوری ٹینکشن ہے مجھے چاہتا ہوں میں نہ آتا۔" پہلے میں انہیں لے گا۔

"بہت سے ساتھیوں کی تلاشیں بھی واپس نہیں لاسکے۔ وہ مل ہی نہیں سکتے۔" کریم بخش کہہ رہا تھا۔ مجھے ان چھ لاشوں کا تپا تھا جو اس وقت برف کی دبیر تسمہ میں ڈب ڈب تھیں۔ ان میں سے بھی شاید ہی کسی کو واپس لے سکتے۔ یہ واقعی برف کا قبرستان ہے۔ ہر ایک جھرجھری کی ٹیبلٹ ریڈیو سے لپک کریم بخش نے آواز دے دیا کہ ایک کراؤنڈ میں بھی دلی دلی تو آجیے ابھر رہی ہیں۔ وہاں ٹیکو فون جو ہال میں تالیوں کی آواز (Capturing) کرنے کے لیے نصب کیے گئے تھے۔ وہ ہال میں موجود حاضرین کی سرگوشیوں کو بھی Transmit کر رہے تھے۔

"اچھا کریم بخش صاحب۔ آپ کو کبھی افسوس ہوا۔ اپنی انگلیوں کے نشان سے؟" یکسیر نے کریم بخش سے پوچھا۔

"نہیں کبھی نہیں۔ میں نے یہ قوم کے لیے قربان کی تھیں۔ قوم کے مستقبل کے لیے۔ کل آنے والے بچوں کے لیے۔ افسوس کیوں ہوتا مجھے۔" ہال میں اس کی گفتگو کے دوران پہلی بار تالیاں گونجیں۔ کریم بخش نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس نے یکسیر کو سانس اور جلد کی ان بیماریوں کے بارے میں نہیں بتایا تھا جن کا شکار وہ پچھلے سولہ سال سے چلا آ رہا تھا۔ فوج سے اس کی جلد ریشہ ریشہ کی وجہ بھی یہی تھی۔ مگر اس نے کبھی اپنی بیماریوں کا ذمہ دار فوج

اور سیاچن کو نہیں گردانا تھا۔

"میں نہیں جانتا کوئی اور جاتا۔ مگر کسی نہ کسی کو تو وہاں جانا ہی تھا۔ اور جو بھی جاتا اس کے ساتھ یہی ہوتا۔ پھر میں کیا کہوں کہ یہ میرے ساتھ کیوں ہوا۔ میں نے اور میرے ساتھیوں نے تو ان لوگوں کے لیے وہاں بنیادیں فرواہم کی تھیں۔ جو آج وہاں ہیں۔ بنیاد کا پتھر بنے تھے ہم۔ ہم پر کتنا بوجھ پڑا۔ کیا معنی رکھتا ہے اس احساس کے سامنے کہ ہم نے جو کچھ کیا۔" قوم کے لیے کیا۔" کریم بخش نے ستارہ جرات کو بچھوتے ہوئے سوچا تھا۔

"کریم بخش صاحب! آپ نوجوان نسل کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے۔" کمپیوٹر کریم بخش سے پوچھ رہا تھا۔ میں بیک گراؤنڈ میں ابھرنے والی سرگوشیاں سن رہا تھا۔ ناراضگی کی ایک لہری میں نے اپنے اندر اٹھتی محسوس کی۔ کیا ہال میں بیٹھے ہوئے ان لوگوں کو احساس نہیں ہے کہ یہ ایک قومی ہیرو کی چند منٹوں پر مشتمل گفتگو خاموشی سے سن سکیں۔ وہ قومی ہیرو جو سیاچن کی پاگل کر دینے والی خاموشی اور تنہائی کا سامنا صرف ان لوگوں کے لیے کرتا ہے۔

"امیرا پیغام یہ ہے کہ۔" وہ ایک بار پھر رک گیا تھا۔ ہال میں ایک بار پھر سرگوشیاں ابھریں۔ میں ہمد تن گوش اس شخص کی بات سننے کے لیے بیٹھا تھا اور مجھے ابھرنے والی ان آوازوں پر غصہ آ رہا تھا۔ جن کی وجہ سے میرے لیے کریم بخش کی بات سننا مشکل ہو رہا تھا۔

"دیکھیں۔۔۔" کریم بخش نے گلا صاف کیا۔ "میں کوئی۔۔۔ کوئی۔۔۔ بہت بڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں۔" اس نے اٹکتے ہوئے بات شروع کی۔ "مجھے تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ مگر کچھ حالات کی وجہ سے میں زیادہ نہیں پڑھ سکا۔" وہ رک گیا۔

کمپیوٹر نے اپنے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ قائم رکھنے کے لیے جدوجہد کی۔ خاتون کمپیوٹر نے اپنے تراشیدہ کھلے بالوں میں ایک بار ہاتھ پھیرا۔ دونوں کو



یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کریم بخش جواب دیتے ہوئے ٹریک سے اتر گیا تھا اور اب دونوں ایک دوسرے کو ایک لحظہ کے لیے دیکھتے ہوئے طے کر رہے تھے کہ یہ اخلت کون کرے گا۔

”ساری عمر مجھے اس کا ہوا افسوس رہا۔ مگر اب میں سمجھتا ہوں کہ میں خوش قسمت ہوں جو زیادہ نہیں پڑھا۔ شاید زیادہ پڑھے لکھے نہ ہونے کی وجہ سے میں اس ملک اور قوم سے اندھی محبت کرتا ہوں۔ زیادہ پڑھ لکھ جاتا تو آج یہاں بیٹھ کر ملک میں کیڑے نکال رہا ہوتا۔“ میری آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھمتھمت لگی۔

میں کوئی بڑا امیر آدمی نہیں ہوں۔ چند مروج زمین ملی تھی مجھے جس پر میں اپنے بیٹوں کے ساتھ کاشت کاری کرتا ہوں۔

مرد کمپیر کے کان میں اڑتے ہوئے ننھے ننھے بیڈفون میں پروگرام پروڈیو مری آواز گونجتی۔

”ایک منٹ کے بعد بات کاٹ دیں اور اس بار انٹرویو کو وائس اپ کروں گا۔“ ٹیکٹ اٹھتی ہے۔ آواز بند ہو گئی۔

”انگلز میں پھر بھی وطنیں ہوں۔ وطن کے لیے کچھ قربان کر اپنے سے وطن کا دشمن نہیں کرتا۔“ مجھے ارافسوس ہے تو صرف یہی کہ میں کتنی بڑا حسد نہیں۔ اور۔ اور مجھے اگر غربت تو صرف اس بات پر کہ میں نے وطن سے تعلق ختم کر لیا۔ میں نے جو ان مہل سے یہی درخواست ہے کہ اس ملک کی قدر کریں۔“

کریم بخش اب خاموش ہو گیا تھا۔

”آپ نے بہت اچھا بیجا بیجا کہنا“ اس ملک کی قدر کریں گے۔ آپ کا بہت محبت شکریہ۔“ کمپیر نے قدرے جلد بازی کے انداز میں انٹرویو کا اختتام کرتے ہوئے کہا۔

میں ریڈیو سے گونجتے والی ان تالیوں کی ہلکی سی آواز کو سن رہا تھا۔ جو کریم بخش کے جانے پر بھالی جارہی تھیں۔ دائیں ہاتھ سے میں نے اپنی آنکھوں میں اترنے والی نمی کو صاف کیا۔ شاید آج سے دس چودہ

سال بعد میں بھی ایسے ہی کسی پروگرام میں کسی ساری باتیں دہرا رہا ہوں گا۔ وطن سے محبت کی۔ نمک حلائی کی۔ اور شاید یہاں کوئی اسی طرح ریڈیو پر بیٹھا یہ سب سن رہا ہو گا۔

”بی نظریہ اب پروگرام میں آگے کیا ہے؟“ خاتون یکمیر، مزد یکمیر سے پوچھ رہی تھی۔

”یہ تو حاضرین سے پوچھنا چاہیے۔“ مزد یکمیر نے کہا۔

”ان سے پوچھ لیتے ہیں۔ اگلے مہمان کو بلایا جائے یا پھر کسی شکر کو؟“ کمپیر اب حاضرین سے پوچھ رہا تھا۔

”انٹرویو۔ نو گیسٹ۔ شکر۔“ ریڈیو سے گونجتے والی آواز میں بہت نمکیاں تھیں۔

ایک لمحہ کے لیے مجھے اپنا خون کھوتا ہوا محسوس ہوا۔ شکر۔ شکر چلانے والے ان لوگوں کو کیا یہ پتا ہے کہ اس وقت بھی ان کے اس عیش و آرام کے لیے کوئی کہاں کہاں بیٹھا ہے۔

”کمپیر، ہم ابراہیم کو دوبارہ بلاتے ہیں۔“

جیسی بارانہوں نے ملی نغمہ سنایا تھا۔ اس بار ہم ان سے ان کا سب سے بگ سا دے جانا مال و مال سننے

کمپیر کے کئے پر ہاں میں تالیوں کی آواز گونج اٹھی۔ تالیوں اور سینکڑوں گانا شور تھا کہ مجھے ریڈیو کا وائس بگڑے کم کر دیا۔ مجھے وہ تالیاں یاد آئیں جو ان لوگوں نے کریم بخش کی تمجید بجاتی تھیں۔

گناکار اب اپنا گانا شروع کر چکا تھا۔ میں تصور کی تکتی سے ہاں میں ہنسنے ہوئے لڑکے اور لڑکیوں کو ناچتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ برگر کلاس کے بڑے بوا اشارتیں اور جینز میں ملبوس لڑکے اور لڑکیاں۔

”ہاتھ اٹھا کر۔ سب مل کر۔“ ابراہیم اب

ہدایات دے رہا تھا۔ میں نے خون آلود دستانے میں چھپا ہوا بالیاں ہاتھ اٹھا کر دیکھا۔ اوتالیس گھنٹوں میں پہلی بار مجھے اس ہاتھ کے زخمی ہونے پر افسوس ہوا اور یہ تصور کر کے تکلیف کہ اسے علیحدہ کر دیا جائے



”اساں تیری گل کرنی۔ گل کرنی اسے ڈیڈی  
گل اساں تیری گل کرنی۔“ گلوکار لنگ لنگ کر گارہا  
تھا۔

وہاں بیٹھے ہوئے زندگی میں پہلی بار میں نے  
سوچا۔ کیا ضروری تھا میں فوج میں آتا۔ اور اس  
قوم کے لیے ان پہاڑوں پر اپنے جسم کے حصوں کو  
باری باری خود سے جدا ہوتے دیکھنا، ضائع کرنا، جو یہ بھی  
نہیں جانتی کہ شہید یا غازی کا احترام کیا ہوتا ہے۔  
میری عمر کے بہت سے لڑکے ابھی تعلیم حاصل کر  
رہے ہوں گے۔ یونیورسٹیز میں کالجز میں۔ بیرون  
ملک۔ اور میں چوبیس سال کی عمر میں اگلے کچھ دنوں  
کے بعد اپنا ہاتھ کٹوا کر ترقی کی ریس سے باہر ہو جاؤں  
گا۔ کس کے لیے؟

ان لوگوں کے لیے جو غازیوں کے بجائے گلوکاروں  
کو اہمیت دیتے ہیں۔ جو ہم سے یہ تک سنے کے لیے  
ہمیں چند منٹ نہیں دے سکتے کہ ہم نے موت کو  
کمال سے کس طرح جاکر دیکھا ہے۔ صرف اس لیے  
کہ ملک کے اندر بیٹھے ہوئے ان لوگوں کے پیش  
وآہام پر کوئی حرف نہ آجائے۔ میں سال بعد واپس میں  
بھی آئے کسی اسٹیج پر یہ بتائے جاؤں کہ میرے سینے پر  
ہاتھ کٹوا کر سچایا جانے والا تھ میرے لیے کیا معنی  
رکھتا ہے۔ تو شاید میں بھی کریم کشن کی طرح بات  
کرتے ہوئے لڑکھڑاؤں گا۔ اور شاید میرے انٹرویو  
کے بعد بھی حاضرین اگلے کسی مہمان کے بجائے کسی  
شکر کو بلوانے کی فرمائش کریں گے۔ تاکہ اس پوریت کا  
سدباب ہو سکے جو انہیں پہلے چند منٹوں کے دوران  
برداشت کرنی پڑی۔ میں کیوں پاکستان کی ان آنے والی  
نسلوں کے لیے اپنا حال قربان گھروں جن کے لیے ہر چیز  
گانے سے شروع ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔ جن  
کے لیے ہر اہم شو اور چھٹی کا ایک اور دن اور ایک اور  
میوزیکل ایونٹ سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اور  
وہ دس انسان پاگل ہیں جو رات کی اس تاریکی میں

اندھوں کی طرح چھڑیوں سے کھائیاں ٹٹولتے۔  
ہڈیوں میں اتر جانے والی اس سرور میں کئی گھنٹوں کا  
سفر کر کے یہاں پہنچیں گے۔ پنچیس کے بھی یا  
نہیں۔

اور اس پہلی کا پڑ کے سائٹ بھی پاگل ہیں جو اپنے  
پروفیشنل سرٹیفیکیشن اور ڈگریوں کے ساتھ عقل کو  
تجھی بھٹاڑ میں جھونکتے ہوئے ان لوگوں کو ان پہاڑوں  
میں اتارنے کے لیے چل پڑیں گے۔ شہادت کی  
صورت میں انہیں ایک اور ستارہ جرات مل جائے  
گا۔ زندہ رہنے پر ایسے کسی شو میں شرکت کا دعوت نامہ  
بھی۔ اور بس زندہ قومیں اپنے شہیدوں اور غازیوں  
کی قربانیوں کو بھلاتی نہیں ہیں۔ مگر ان کے پاس ان  
قربانیوں کے لیے عزت نہیں ہوتی۔ میرا دل چاہ رہا  
ہے میں اب یہاں سے بھاگ جاؤں۔

پہلی بار میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں۔ میں یہاں ان  
لوگوں کے لیے۔

وائٹریس پر میرے لیے کوئی پیغام آ رہا ہے۔ میں  
نے وائٹریس آن کیا۔

”مورال کیسا ہے کیپٹن ولید۔“ دوسری طرف  
سے میرے C.O. نے کہا ”Skyhigh sir“ (آسمان  
سے اونچا) پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں چودہ دفعہ میں  
نے یہ کہا تھا۔ مگر اس بار میں کچھ بھی نہیں بول سکا تھا۔  
”مورال کیسا ہے؟“ انہوں نے ایک بار پھر دہرایا۔  
”مورال؟“ میں بڑبڑایا۔

”کس کو بلائیں اگلے مہمان کو یا شکر کو؟“  
”نوا شروپو۔ نوگیٹ۔ شکر۔ شکر۔“

”مورال کیسا ہے کیپٹن ولید؟“

”مورال۔“ میں پھر بڑبڑایا۔

”پتا نہیں سر۔“ میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے  
کہا۔

